Date of Publication : 23-05-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 May 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 June 2014
Issue: 21, Vol.:73

یکم تا ۷ رجون ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۱، جلد نمبر: ۷۳

ابنِ صفی کا تخلیقی وادبی رجحان: ایک مختصر جائزہ

محمد عارف اقبال (اڈیٹر اردو بک ریویو، نئی دہلی)
E-mail: urdubookreview@gmail.com

غالباً یہ مارچ یا اپریل 1958 کی بات ہے جب مشتاق احمد قریشی اردو کالج کراچی کے آفس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ملے اور ابن صفی کے بارے میں ایک مشہور و معروف ادیب کی شکایت کی تو مولوی عبدالحق مرحوم نے مشتاق احمد قریشی سے برملا فرمایا تھا:

''اردو پر ابن صفی کا بڑا احسان ہے۔''

ابن صفی مرحوم (پ: اپریل 1928 — و: 26 جولائی 1980) کے چہیتے شاگرد اور ''نئے افق'' کراچی کے ایڈیٹر مشتاق احمد قریشی لکھتے ہیں:

''ابن صفی کے ساتھ ساتھ اسرار احمد ناروی بھی آخری وقت تک زندہ رہا۔ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ذات میں جمع تھیں اور ان میں کوئی آویزش نہ تھی۔ اسرار احمد ناروی داغ کے جانشین اور زبان و بیان کے استاد حضرت نوح ناروی کے بھتیجے تھے۔ زبان و بیان کے نکات انھیں ورثے کے طور پر ملے۔ جذبات و افکار ان کے اپنے تھے۔''

اردو دنیا کے معروف فکشن رائٹر ایم اے راحت اپنے محبوب اور محسن ادیب ابن صفی کے بارے میں کیا لکھتے ہیں، ذرا ملاحظہ کیجیے:

''سینتالیس سال سے قلم کو زندگی کا سہارا بنا رکھا ہے۔ تھوڑا سا لفظوں کا کھیل آ گیا ہے لیکن جس ہستی کے بارے میں کچھ کہنا ہے اس کے لیے الفاظ کی بازیگری ممکن نہیں۔ سو قلم کو سادگی کی سیاہی میں ڈبو کر سچ لکھنا زیادہ بہتر تھا۔ میرا تعلق ہندوستان کے شہر علی گڑھ سے ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ چھوٹی عمر تھی۔ بچوں کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ ایک لائبریری سے رابطہ تھا، اس دن کوئی کہانی نہ ملی تو لائبریرین نے ایک کتاب دے کر کہا اسے پڑھو۔ اس کتاب کا نام 'پتھر کی چیخ' تھا۔ یہاں سے ابن صفی سے عشق ہوا اور یہ عشق اس منزل تک لے آیا کہ خود تحریر نگار بن گیا۔ بصد خلوص یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ انہیں پڑھ کر میں نے پڑھنا سیکھا۔ لکھنا تو بہت بعد کی بات ہے، اور میں ہی نہیں، آج ایسے بے شمار لکھنے والے ہیں جو محترم ابن صفی کے بتائے راستے پر چل کر خود کو ادیب کہلوا رہے ہیں جن میں میں بھی شامل ہوں۔''

(خصوصی تحریر ۲۰۱۲ء)

جاسوسی ادب کے حوالے سے اردو دنیا کے عظیم ادیب اور ناول نگار ابن صفی کی ادبی خدمات کا اعتراف اردو کے چند ادیبوں اور نقادوں نے بھلے ہی نہ کیا ہو لیکن ایک دنیا جانتی ہے کہ ابن صفی کا قد اردو ادب میں نہ صرف بلند تھا بلکہ منفرد اسلوب و ناول نگاری میں وہ اپنے فن کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اس کا بخوبی اندازہ ان کے 250 سے زائد شاہکار ناولوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کے حوالے سے ماہر اقبالیات اور تاریخ داں خرم علی شفیق کی دو کتابیں ''سائیکو مینشن'' اور ''رانا پیلس'' شائع ہو چکی ہیں۔ خرم علی شفیق نے ابن صفی کی ذات علامہ اقبال کے ''مردِ بزرگ'' میں کی ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

ابن صفی جاسوسی ناولوں کی طرف کیوں آئے اس کا پس منظر انھوں نے اپنے ایک مضمون ''بہ قلم خود'' میں بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی اور تخلیقی ادب کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا تھا۔ ابتدا ہی سے شاعری، انشا پردازی اور افسانہ نگاری ان کا خاص میدان رہا۔ جاسوسی ادب تخلیق کرنے سے قبل ان کی 100 سے زائد تخلیقات ماہنامہ نکہت، الہ آباد اور دیگر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ افسوس کہ ان تخلیقات کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ افسانہ نگاری اس وقت شروع کی تھی جب کہ وہ ساتویں کلاس کے طالب علم تھے۔ اس زمانے کے معروف ادیب اور ہفت روزہ 'شاہد' کے مدیر عادل رشید نے انھیں ''مصورِ جذبات'' کا خطاب دیا تھا۔ اسرار ناروی کی شاعری پر ان کے ایونگ کرسچن کالج، الہ آباد کے دو اساتذہ پروفیسر انوارالحق (صدر شعبۂ اردو) اور انگریزی کے استاد مسٹر ہگنس نے غیر معمولی تبصرہ کیا تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی جد و جہد کے دوران میں ہی اسرار احمد ناروی نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں شاعری کی ابتدا کی۔ جب انھوں نے اپنی نظم ''آخری التجا'' کالج کے ایک مشاعرے میں سنائی تو تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ 1948 میں ان کا پہلا انشائیہ 'فراز' قلمی نام طغرل فرغان سے ماہنامہ 'نکہت' الہ آباد میں شائع ہوا تو ان کے قلم کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت کے ''جوہریوں'' کو بخوبی ہو گیا تھا۔

ان کے کلام میں ادبی روایت سے انحراف اور ادب میں احتجاج کا انوکھا انداز محسوس کیا گیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ان کے ایک استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب ''ملکِ ادب کے شہزادے'' میں ابن صفی (اسرار ناروی) کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا اور مستقبل کے لیے بہت سی امیدیں باندھیں۔ اسرار ناروی کی نظم ''بنسری کی آواز'' سن کر ان کے انگریزی کے استاد مسٹر ہگنس (Mr. Higgins) نے جو اردو شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، کہا تھا ''فراق صاحب کی رباعیات اور بنسری کی آواز کے علاوہ مجھے تو اور سب کچھ Echo of Poetry (شاعری کی بازگشت) معلوم ہو رہا تھا۔'' واضح ہو کہ اس وقت ابن صفی ایونگ کرسچن کالج، الہ آباد میں

جاسوسی ادب کے حوالے سے اردو دنیا کے عظیم ادیب اور ناول نگار ابن صفی کی ادبی خدمات کا اعتراف اردو کے چند ادیبوں اور نقادوں نے بھلے ہی نہ کیا ہو لیکن ایک دنیا جانتی ہے کہ ابن صفی کا قد اردو ادب میں نہ صرف بلند تھا بلکہ منفرد اسلوب و ناول نگاری میں وہ اپنے فن کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اس کا بخوبی اندازہ ان کے 250 سے زائد شاہکار ناولوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

سینکڑا ایٹر کے طالب علم اور "بزم ادب" کے صدر بھی تھے۔ اسی سال سالانہ مشاعرے میں ابن صفی نے اپنی نظم "بنسری کی آواز" پڑھی تھی۔

جاسوسی ادب کے آغاز (مارچ 1952) سے قبل ابن صفی کی شعری تخلیقات کے ساتھ نثری ادب میں جو معرکہ آرا تخلیقات منصۂ شہود پر آئیں ان میں 'میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں؟'، 'آب حیات کی پیروڈی'، 'آپ وفات'، وصی عبدالغفار کی 'مجنوں کی ڈائری' کی پیروڈی، 'دیوانے کی ڈائری'، جاسوسی، ایک ادبی نشست، اب کدھر جاؤں وغیرہ خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ابن صفی کے تخلیقی اور ادبی رجحان کی روشنی میں معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین (21 اپریل 1912 — یکم دسمبر 1972) کا ایک تنقیدی جائزہ بھی قابل توجہ ہے جو 1948 میں "اردو ادب: دوسری جنگ عظیم کے بعد" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"...ادب کا اصل موضوع انسان اور اس کی بدلتی ہوئی حالت ہے۔ گو روایتی انداز اور نقالی کے سہارے جینے والا ادب بدلتی ہوئی زندگی سے ہم آغوش نہیں ہوتا لیکن باشعور ادیبوں میں سے اکثر سماجی حقائق ہی کو اپنے افسانوں، شعروں، ڈراموں اور ناولوں میں تخیلی اور جذباتی پیکر دیتے ہیں۔ اس لیے، اردو ادب کے مطالعہ میں جنگ کے خاتمہ کو کسی میکانکی نظر سے دیکھنا صحیح نہ ہوگا بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ جنگ کے زمانے اور جنگ کے بعد ہندوستان اور اس کے سیاسی و سماجی مسائل میں کیا خاص فرق پیدا ہوئے اور اردو کے ادیبوں کے یہاں ان کا عکس کس حد تک ہوا۔"

پروفیسر سید احتشام حسین کے اس تنقیدی جائزے کی روشنی میں ابن صفی کے ادبی نصب العین پر نگاہ مرکوز کی جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ادب کے بدلتے ہوئے منظرنامہ میں انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کی تخلیقی سوچ ہمیشہ منفرد اور عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتی تھی۔ سماج اور تاریخ پر ان کی نہ صرف گہری نظر تھی بلکہ ان کی شخصیت فکری بصیرت سے مالا مال تھی۔ ان کا ایک افسانہ "جنس کی ناک" ملاحظہ کیجیے۔ اس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ ابن صفی کا ذہن کس قدر باریک بیں تھا اور مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کا عادی تھا۔ "آپ وفات" پیروڈی 1952 سے قبل لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی کتاب "اردو ادب: آزادی کے بعد" شائع ہوئی تو اس میں اس پیروڈی کا حوالہ دیتے ہوئے اسے نقل بھی کیا گیا تھا۔ معروف نقاد پروفیسر سید احتشام حسین نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی آزادی کے بعد کے اثرات پر جو تبصرہ کیا ہے، چند جملے ملاحظہ کیجیے:

"۱۵ اگست تاریخ ہند کا سنہرا ورق بن گیا۔ اردو کے بہت سے ادیبوں نے جشن آزادی میں شرکت کی اور بہت سے مبہوت ہوکر رہ گئے کیوں کہ اس آب حیات میں زہر آب کی آمیزش بھی شامل تھی۔ جس طرح جنگ ختم ہوئی تھی مگر انسانیت غیر معمولی کرب میں مبتلا تھی اسی طرح آزادی ملی تھی لیکن آزادی کا پرچم خون میں ڈوبا ہوا تھا۔..."

اس پس منظر میں ابن صفی یا طغرل فرغان کے محسوسات بھی کم کرب ناک نہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے مضمون "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟" میں اپنے احساسات اور آئندہ کے عزائم کو اس طرح اظہار کیا:

"بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں، ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کر دیا 'یہ نہ ہونا چاہیے تھا یہ بہت برا ہوا' لیکن ہوا کیوں؟ ... تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمہارے گیت دیوانگی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔"

ابن صفی نے اپنے اس مضمون میں 1947 کے کربناک حقائق اور اس وقت کے حالات کے تجزیے سے جس نتیجے پر پہنچے اور ادب میں جس منفرد اسلوب کی بنیاد ڈالنے کا عزم کیا، اس کا اظہار کچھ اس طرح کیا:

"میں سوچتا... سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ بس میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انھیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔"

ابن صفی نے اس مضمون میں اپنے ادبی مشن اور نصب العین کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ اردو کے چند ادیب اور نقاد آج بھی اپنی عدم واقفیت کے سبب ابن صفی کے ادبی مشن کو محض تفریح قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس ادبی رویے پر افسوس تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اردو ادب میں نقادوں کی ذہنی پس ماندگی اور ان کے متضاد رویے نے آزادی کے بعد ادب کے ارتقا اور نشو و نما کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو دنیا میں ابن صفی کے نقال تو مشروم کی طرح پیدا ہوئے لیکن اور بجز مقبول تخلیق کاروں میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس ایسے ادیبوں اور شاعروں کی بھیڑ ضرور دکھائی دیتی ہے جو ایڑی اٹھا کر اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انھیں ذاتی طور پر انعامات و اعزازات بھی دیے جاتے رہے ہیں مگر ان کی تخلیقات سے اردو عوام یا اردو ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بعض شعرا، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات کو چند ادیبوں اور نقادوں کی جانب سے بظاہر نقد و ادب کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی شان میں قصیدے بھی پڑھے اور لکھے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ عوام میں کتنے مقبول ہیں اور کتنے فیصد اردو کے قارئین ان کی تخلیقات کو اپنے دل کی آواز کہتے ہیں۔ شاید یہی سوال عصر حاضر کے معروف ادیب و نقاد شمس الرحمن فاروقی کے سامنے بھی تھا۔ لہٰذا جب انھوں نے تجزیہ کیا تو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ ابن صفی ہمارے زمانے کے مقبول ترین ناول نگار تھے اور ابھی ان کی مقبولیت باقی ہے، چاہے پہلے جیسی نہ ہو۔ جب مجھ جیسے طالب علم کتابوں کی دکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے کہ ابن صفی کا ناول سب سے پہلے ہمارے ہاتھ آجائے۔ اردو ہی نہیں، دنیا کے جاسوسی ادب میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی جاسوسی ناول نگار کی موت کے اتنی مدت بعد بھی اس کے ناول پڑھے جاتے رہیں۔ میری نسل (یعنی وہ نسل جو دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد پروان چڑھی) کے سامنے انگریزی کے جو مقبول ترین جاسوسی ناول نگار تھے، ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا نام آج لوگوں کو یاد ہو، اس کے ناول کا مقبول ہونا تو دور کی بات ہے۔"

شمس الرحمن فاروقی نے اردو دنیا میں ابن صفی کی مقبولیت کے بارے میں جو اعتراف کیا ہے اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ خود بھی ابن صفی کے ناولوں کے رسیا رہے اور آج ان کی شخصیت ایک معتبر ادیب و نقاد کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک معتبر اور مستند دانشور، محقق اور نقاد کی ہے۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں "جاسوسی ادب کے بحث" کو تحلیل کرنے کی کوشش کی۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے مارچ 2007 میں انھی کے ایما پر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے حوالے سے جرمن اسکالر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا لیکچر رکھا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے کلیدی خطبہ بھی پیش کیا۔ اپنے خطبہ میں انھوں نے بجا طور سے یہ سوال اٹھایا کہ "... اگر جاسوسی ادب، ادب نہیں ہے تو جاسوسی کے ساتھ لفظ ادب لگاتے کیوں ہیں...؟ پہلے تو یہ ہے کہ ہم خود تنقید و جمالیات کے شکار ہیں اور پھر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور پھر جب ادبی تاریخیں لکھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری اور تربیت کی ہے۔ جنھوں نے ابن صفی کو چوری چھپے بھی پڑھا ہے، اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بیشتر معاصر تاریخیں ہیں اردو ادب کی، وہ ابن صفی کے contributions اور ان کے ذکر سے خالی ہیں۔"

معروف شاعر سرشار صدیقی (پ: 25 دسمبر 1926) کانپور میں پیدا ہوئے، حلیم ڈگری کالج، کانپور میں تعلیم حاصل کی اور 1950 میں ہجرت پاکستان چلے گئے۔ ان کی پہلی غزل 1944 میں علامہ نیاز نے 'نگار' میں چھاپی تھی۔ ان کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی ان کے "ادبی تبصروں کا مجموعہ" شائع ہوا اور "زخم گل" کے نام سے ان کا ایک منظوم ڈراما بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ سرشار صدیقی نے جب ابن صفی کی "بازیافت" کی 1972 میں ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے لکھا کہ "... ابن صفی کا لاشعور جس میں اب بھی اسرار ناروی پوشیدہ ہے، اس راہ پر چلنے کے لیے سوچ رہا ہے جہاں وہ اپنے اس ظاہری وجود کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جس کا نام ابن صفی ہے، اپنے باطنی وجود کی تکمیل ذکر کیے جیسے اسرار ناروی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے — اپنی فکری دنیا کے مسیح موعود کی طرح۔"

اپنے اسی مضمون میں سرشار صدیقی نے ابن صفی کی ادبی خدمات کو بعض اردو ادیبوں اور نقادوں کی جانب سے نظرانداز کیے جانے کے اسباب پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"نقادوں کا ایک اور طبقہ ہے جو شدید احتیاط پسندی کا مریض ہے۔ جب تک کسی اہل قلم پر چند بڑے نقاد کھل کر اظہار خیال نہیں کر لیتے، اس وقت تک یہ احتیاط پسند نقاد اس اہل قلم پر اپنی رائے دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ یہ لوگ ادب میں احساس کمتری کی بدترین مثالیں ہیں اور ان نقادوں سے بھی فروتر ہیں جو اپنی حاجت روائی کے لیے اپنے نظریاتی حریف کا قصیدہ لکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر لکھنوی (16 نومبر 1917 — 23 ستمبر

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

فارسی میں ہندستان کے تہذیبی و اخلاقی سرمایے کا عروج و زوال

عارف عزیز (20-گھائی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال 462001)

فارسی زبان و ادب کی ہندستان میں ترقی مغلوں کی خصوصی سرپرستی کا نتیجہ ہے، جس کے بعد فارسی نہ صرف سرکاری بلکہ ادبی و تہذیبی زبان کے درجے پر فائز ہوگئی۔ بادشاہوں، شہزادوں اور سلاطین نے بھی اس زبان کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا، یہاں تک کہ ان کی توجہ سے سنسکرت کے مختلف علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں منتقل کی گئیں۔ مہابھارت، گیتا، اپنشد، جوگ بششٹھ وغیرہ کے ترجمے نے ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے فروغ اور ہندستانی زبانوں کو فارسی سے قریب کرنے میں مدد کی۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی ہندستان کے طول و عرض میں تعمیر ہونے والی عمارات پر فارسی کے کتبات، نقوش اور طغرے فارسی کی وسیع و عریض فرماں روائی کا کھلا ثبوت ہیں۔ اس زمانے میں فارسی زبان کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ صرف سرکار و دربار میں ہی نہیں محلوں میں بھی یہی زبان رائج تھی، جو فارسی نہیں جانتے وہ غیر تعلیم یافتہ کہلاتے تھے۔ اس کی شیرینی، ترو تازگی، ہمہ گیری اور دل کشی کے آگے دوسری تمام زبانوں نے ایک طرح سے خود سپردگی کردی تھی۔ اس دور کے تعلیمی و تہذیبی ادارے جو ملک کے چپے چپے پر قائم تھے، مندروں، مسجدوں، اصحاب حیثیت ہندو مسلمانوں کی ڈیوڑھیوں اور جنگلوں میں چل رہے تھے اور ان میں ہندو مسلمانوں کے بچے جو کتابیں پڑھ رہے تھے، وہ فارسی میں تھیں، خاص طور پر کریما، مقیما، گلستاں، بوستاں، پند نامہ، انوار سہیلی کا پڑھنا ہر طالب علم کے لیے ضروری تھا۔ اس سے آگے بڑھتے تو حافظ شیرازی، عرفی، نظیری، مولانا روم اور فردوسی کی غزلیات، قصائد، مثنوی اور شاہنامے کی تعلیم ہوتی۔

ان کتابوں کے درس و تعلیم کا نتیجہ صرف یہی نہیں تھا کہ نئی نسل کو فارسی زبان میں مہارت حاصل ہوتی، یہ بھی ہوا کہ ان کتابوں میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے اخلاقی محاسن، تہذیبی نکات اور فکر کی پاکیزگی سے بھی وہ ایسی متعارف ہوئی کہ اس کے آگے اخلاقی پستی، ذہنی کثافت، عریانیت و فحاشی یا غیر شریفانہ عادات و اطوار دماغ میں جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اسی اخلاقی و تہذیبی برتری کا نتیجہ تھا کہ ہندستان کے باشندے عرصے تک انگریزوں کی فکری یلغار اور ان کی تہذیبی چمک دمک سے متاثر نہیں ہوئے اور فوجی و عسکری سطح پر شکست کھانے کے باوجود ان کی تہذیب اور کلچر کے آگے خود سپردگی پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بجائے وہ انگریزوں کی تہذیب کو قابل نفرت اور ان کے وجود کو اتنا بڑا دشمن گردانتے رہے کہ کسی انگریز سے ہاتھ ملانے کے روادار بھی نہ تھے۔

اس تہذیب اور کلچر نے ہندستانیوں کو ذہنی طور پر اتنا بلند بنادیا تھا کہ محکوم ہونے کے باوجود انگریزوں کو اپنے سے کمتر خیال کرتے تھے اور فرنگی تہذیب کو شیطانی تہذیب قرار دیتے تھے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں انگریزوں کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ اس زبان کو ختم کرنے کی فکر سب سے پہلے کریں جو اس ذہنی پاکیزگی اور تہذیبی برتری کا سرچشمہ ہے۔ اس ایک ضرورت اور ناگزیر سبب کے سوا اس زبان کو ختم کرنے کے فیصلے میں ایک دوسرا اور اہم مقصد یہ بھی شامل تھا کہ ہندستان کے تہذیبی رشتے کو باقی دنیا سے منقطع کردیا جائے۔ فارسی زبان کے چلن کی بدولت ہندستان کا رشتہ نہ صرف افغانستان بلکہ اس سے بھی آگے ایران، ماوراء النہر یعنی بخارا، سمرقند، تاشقند، آرمینیا اور آذربائیجان تک کے علاقوں سے براہ راست قائم تھا۔ یہ علاقے اس وقت تک چین اور روس کے زیر اقتدار نہیں آئے تھے، انگریز ہندستان کی تاریخ اور اس کی تقدیر پر افغانستان اور ایران کے فیصلہ کن اثرات سے بخوبی واقف تھے اور ان خطرات سے بھی جو مستقبل میں ان ملکوں کی طرف سے ہوسکتے تھے۔ آج کے ہندستان میں یہ بات خواہ عجیب اور معمولی لگی جائے، لیکن انگریزوں کے دور حکومت میں ۱۹۲۰ء بلکہ ۱۹۳۰ء تک افغانستان کی حکومت ہندستان میں انگریزی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ مانی جاتی تھی، اس کی ایک مثال کابل میں ہندستان کی جلا وطن حکومت کے قیام کی صورت میں تاریخ کے صفحات پر رقم ہے اور اسی لیے انگریز جس ہندستان کو تاج برطانیہ کا سب سے قیمتی ہیرا قرار دیتے تھے، افغانستان کے امکانی حملوں سے محفوظ رکھنے کی فکر اور سازشوں میں مسلسل مصروف رہے۔

ہندستان سے فارسی کے چلن اور یہاں کی سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں سے فارسی کے تہذیبی پس منظر کو مٹانے کے فیصلے کے مطابق ہی انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج میں دیسی زبانوں کو ترقی دے کر فارسی کے مقابلے میں کھڑا کردینے کی جدوجہد شروع کی تھی اور اس مقصد سے انھوں نے ایسی سرگرمی، ایسی دلچسپی، ایسی جدوجہد اور انہماک کے ساتھ کام کیا کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہونے سے پہلے پہلے اردو اور انگریزی زبانیں علمی اور لسانی اعتبار سے پائیدار بنیادوں پر کھڑی ہوگئیں۔ اس عرصے میں انھوں نے ایک طرف انگریزی زبان کی تعلیم اور اس تعلیم کے ساتھ معاشی فائدے وابستہ کردیے اور دوسری طرف دیسی زبانوں کی مقبولیت میں اضافہ کرکے ان کا چلن عام کرنے اور انھیں سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنی سرپرستی میں آگے بڑھانے کی ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ فارسی زبان یہاں کے تعلیمی، معاشرتی، سماجی اور سرکاری اداروں سے مکمل طور پر بے دخل ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ وقت آگیا کہ وہ ہندستان میں ایک اجنبی، بیرونی اور غیر ملکی زبان کی حیثیت تک پہنچ گئی۔

ہندستانی مشاہیر میں گرامی چشتی فارسی کے آخری شاعر تھے اور پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد وہ آخری آدمی تھے جنھوں نے فارسی کی مکتبی تعلیم مسجد کے اس مدرسے میں حاصل کی تھی جس کا وجود بیسویں صدی کی ابتدا تک قائم تھا۔ فارسی زبان کی تعلیم اور رواج کے خاتمے کا نقصان صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ پڑوسی ملکوں افغانستان، ایران اور روس و چین، ترکستان کے ساتھ ہمارے لسانی اور تہذیبی روابط ختم ہوگئے اور تہذیبی تعلقات کے احیا و استواری کی آسان اور فطری بنیادیں موجود نہ رہیں بلکہ ہندستانی تہذیب سعدی کی دانش و حکمت، حافظ کی متصوفانہ اور حکیمانہ سرشاری، مولانا روم کی مضطرب روحانی جستجو اور بلند پروازی، عطار کی پند و نصیحت سے بھرپور اخلاقی تعلیم، فردوسی کے پرشکوہ رزمیہ انداز بیان، عرفی و نظیری کی شوکت خیالی کے لازوال خزانوں سے محروم ہوگئی، اس طرح اخلاقی تربیت نیز بلند خیالی کا وہ سرچشمہ خشک ہوگیا جو صدیوں تک ہندستانی تہذیب کی سیرابی، سرسبزی اور شادابی کا سبب بنا رہا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں، اب سے پچھتر برس پہلے تک کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ ہندستان میں ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب فارسی کا چلن اس ملک سے ختم ہوجائے گا اور اس کے جاننے والے تلاش کرنا پڑیں گے۔ تقسیم ملک سے پہلے تک اس مشترکہ تہذیب کا وقار اور عظمت جس کی نشو و نما میں فارسی زبان اور اس کے اندر سموئے ہوئے کلچر نے سب سے بڑا حصہ لیا تھا اس حد تک باقی تھی کہ خالص ہندو ریاستوں میں راجاؤں اور ان کے راجکماروں کے لیے فارسی کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی، نہ صرف جے پور، جودھ پور، گوالیار، کپورتھلہ اور پٹیالہ جیسی غیر مسلم ریاستوں میں سرکاری طور پر فارسی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ نیپال تک کے شاہی خاندان کے لیے فارسی اور اردو کی باقاعدہ تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی اور اسے مہذب ہونے کی سند اور ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد یہ صورت باقی نہ رہ سکی۔ مرحوم رشید محمود آبادی کے بقول "مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے پاس دولت، حکومت، تجارت اور سیاسی قوت میں سے کوئی چیز باقی نہ رہی اور ایک کلچر کے سوا کوئی اثاثہ نہ بچا، جس کی بنا پر وہ برادران وطن پر اپنی برتری ثابت کرسکتے تھے۔ یہ امتیاز بھی تقسیم کے بعد ختم ہوگیا۔ اس نقصان کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔"

آج ملک بھر میں جس اخلاقی انحطاط کا ماتم برپا ہے اور نئی نسل کے اندر روز افزوں وحشت کے رجحانات تشویش کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ تعلیم گاہوں اور دانش کدوں میں اخلاقی تعلیم کو دوبارہ جاری کرنے کا جو شدید احساس دکھائی دے رہا ہے وہ دراصل اسی کمی کا نتیجہ ہے جو فارسی کلچر کے زوال اور فارسی تعلیم کی منسوخی کے باعث پیدا ہوگئی ہے۔ جس قوم کے بچوں کے ذہن کا مرقع گلستاں اور بوستاں کی موعظت، پند نامہ عطار کی حکمت و اخلاق، حافظ کی ژرف نگاہی، مثنوی مولانا روم کی آفاقیت اور روحانی تاثیر، نظیری و عرفی کے قصائد کی شوکت خیال اور فردوسی کے شاہنامہ کی جلالی ہوتی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

اردو اساتذہ کی 35 اسامیاں پھر خالی چھوڑ دی گئیں

ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے صرف 30 اسامیوں کا رزلٹ جاری کیا، اردو حلقوں میں برہمی کا اظہار

نئی دہلی (۱۵رمئی) دہلی کے سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے تعلق سے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کے افسروں کا جانبدارانہ رویہ کھل کر سامنے آچکا ہے۔ اردو اساتذہ کی تقرری کے معاملے میں ڈائرکٹوریٹ کا عمل قطعی سنجیدہ نہیں ہے اور جو اسامیاں پہلے سے منظور کی جاچکی ہیں ان پر بھی تقرریوں کا عمل کئی سال سے التوا میں پڑا ہوا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں 65 اسامیوں کے لیے لیے گئے امتحان کا رزلٹ اب سامنے آیا ہے اور وہ بھی صرف 30 اسامیوں کے لیے۔ ۲۰۱۲ء میں اردو اساتذہ کی 65 اسامیاں پُر کرنے کا عمل شروع ہوا تھا لیکن ڈائرکٹوریٹ نے اب جو رزلٹ آؤٹ کیا ہے اس میں 65 میں سے صرف 30 اساتذہ کو منتخب قرار دیا ہے لیکن باقی 35 سیٹوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس بارے میں کچھ بتانے کو تیار ہے۔ اس سلسلے میں ایک آر ٹی آئی کارکن نے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ سے معلومات طلب کیں تو پتہ چلا کہ 65 اسامیوں کے لیے 1200 امیدوار امتحان میں بیٹھے تھے۔ مئی ۲۰۱۲ء میں ہوئے اس امتحان میں 1200 میں سے 200 امیدوار پاس ہوئے، ان میں سے 65 اسامیوں کے لیے صرف 30 کا ہی انتخاب کیا گیا جب کہ 35 اسامیوں کو خالی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے لیے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے یہ دلیل پیش کی کہ انھیں اہل امیدوار نہیں ملے۔ دوسری جانب آر ٹی آئی کے ذریعے کاپیاں نکلوانے پر یہ بات سامنے آئی کہ امیدواروں کی کاپیوں کو ٹھیک ڈھنگ سے چیک ہی نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں سازش کا خدشہ اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ کاپیوں کی مارکنگ کے وقت نہ تو کہیں کوئی کاٹ چھانٹ کا نشان ہے اور نہ ہی کسی غلطی کو دائرے میں لایا گیا بلکہ نیلے پین سے ہر صفحے پر صرف ٹِک کا نشان ڈال کر ہر سوال پر 20 میں سے کسی پر پانچ، کسی پر 6 اور کسی پر 7 نمبر دیے گئے ہیں تاکہ زیادہ امیدوار امتحان پاس نہ کر پائیں اور سیٹیں خالی رہ جائیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

کرناٹک میں پرائمری سطح پر کنڑا کا لزوم برخاست

سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ

ذریعۂ تعلیم کا انتخاب طلبہ کے سرپرستوں کا دستوری حق

گلبرگہ (۷رمئی)۔ سپریم کورٹ کی پانچ رکنی دستوری بنچ نے کل ایک اہم فیصلہ سناتے ہوئے کرناٹک میں پرائمری تعلیم صرف کنڑا زبان میں دینے کے لزوم کو برخاست کردیا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے اردو اور انگلش میڈیم مدارس کو بڑی راحت ملی ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں واضح کردیا ہے کہ ریاستی حکومت پرائمری تعلیم کنڑا زبان میں دینے کو لازمی قرار نہیں دے سکتی۔ ذریعۂ تعلیم کا انتخاب طلبہ کے سرپرستوں کا دستوری حق ہے۔ پرائمری تعلیم مادری زبان میں حاصل کرنا بھی بچوں کا دستوری حق ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومت کرناٹک کی تعلیمی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت اپنی تعلیمی پالیسی زبردستی مسلط نہیں کرسکتی۔ یاد رہے کہ حکومت کرناٹک نے کنڑا انجمنوں کے مسلسل دباؤ کے تحت ۱۹۹۴ء میں اطلاعیہ جاری کرتے ہوئے اول تا چہارم جماعت کنڑا میں تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔ اس اطلاعیہ کو امدادی و غیر امدادی مدارس کی فیڈریشن نے کرناٹک ہائی کورٹ میں چیلنج کیا تھا۔ کرناٹک ہائی کورٹ نے پرائمری تعلیم کنڑا زبان میں دینے کے حکومت کرناٹک کے لزوم کو برخاست کردیا تھا جس کے خلاف حکومت کرناٹک نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی تھی۔ سپریم کورٹ کی دو رکنی بنچ نے اس مقدمے کو سپریم کورٹ کی پانچ رکنی دستوری بنچ کو منتقل کیا تھا۔ سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے حکومت کرناٹک اور مدارس کی فیڈریشن کے دلائل کی سماعت کرنے کے بعد کرناٹک ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ پرائمری تعلیم کے لیے کنڑا کے لزوم کو برخاست کرنے کے فیصلے پر چیف منسٹر کرناٹک سدارامیا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا ہے۔ تاہم وہ اس سلسلے میں قانونی ماہرین سے مشاورت کررہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلے پر ریاست کی کنڑا تنظیموں نے شدید ردعمل ظاہر کیا ہے اور ان کی جانب سے سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کے خلاف اپیل دائر کرنے کے لیے ریاستی حکومت پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ امدادی وغیر امدادی مدارس کی فیڈریشن جس میں اردو اور انگلش میڈیم کے مدارس شامل ہیں، نے سپریم کورٹ کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے ایک تاریخی فیصلہ قرار دیا ہے۔ فیڈریشن کے عہدیداروں نے کہا ہے کہ اگر ریاستی حکومت کنڑا انجمنوں کے دباؤ کے تحت سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کے خلاف اپیل کرتی ہے تو وہ بھی اپنی قانونی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ (انقلاب، حیدرآباد)

محبانِ اردو سے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے اور اردو اخبارات خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنے کی اپیل

حیدرآباد۔ سید مجتبیٰ عابدی، آغا دوست علی اور سید شکیل عابدی نے محبانِ اردو پر زور دیا کہ وہ اپنے نونہالوں کو دوسری زبانوں کی تعلیم کے ساتھ اردو بھی پڑھائیں اور اردو اخبارات پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ مجتبیٰ عابدی نے کہا کہ ریاست میں اب جو بھی نئی حکومت اقتدار میں آئے گی اردو کونسل دوبارہ سے بھی سائن بورڈوں کی سروے رپورٹ سے واقف کروائے گی۔ انھوں نے محبان اردو اور اردو اخبارات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس مہم کو کامیاب بنانے میں اپنی تجاویز اور مشورے 16-4-733 نئی سڑک چنچل گوڑہ کے پتے پر روانہ کرنے کی خواہش کی ہے۔ (رہنمائے دکن، حیدرآباد)

پی یو ایم ایس کے ذریعۂ تعلیم اردو کو ختم کرنے کی سازش

محکمۂ آیوش نے اردو کی جگہ انگریزی لازمی کرنے کے لیے سینٹرل کونسل فار انڈین میڈیسن سے سفارش طلب کی

نئی دہلی (۱۰رمئی)۔ جس طرح سے یو پی ایس سی نے اپنی لسانی فہرست سے عربی اور فارسی کو یہ کہتے ہوئے باہر کردیا کہ یہ دونوں زبانیں ہندوستانی نہیں بلکہ غیر ملکی ہیں، اسی طرح محکمۂ آیوش بی یو ایم ایس کا ذریعۂ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی کرنے کی سفارش کرکے اردو کو ختم کرنے کی سازش کررہا ہے۔ یہ یوں کہا جائے کہ ایک طرح سے طب یونانی کو ہی دفن کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ محکمہ آیوش کی دلیل ہے کہ ملک سے اردو زبان ختم ہوتی جارہی ہے اس لیے یونانی طریقۂ علاج کی تعلیم اردو کے بجائے کیوں نہ اب انگریزی میں ہونی چاہیے۔

محکمہ نے اس کے لیے سی سی آئی ایم (سینٹرل کونسل فار انڈین میڈیسن) سے وضاحت طلب کی ہے، جو بہت ہی شرمناک ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی وراثت ختم ہورہی ہے تو اس کے تحفظ کی جانب دھیان دیا جائے۔ محکمۂ آیوش کا اردو پر وضاحت طلب کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اردو کو ختم کرنے کے لیے اردو والے طبقے کی رضامندی چاہتا ہے۔ اگر ملک میں غریبی بڑھتی جارہی ہے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ غریبوں کو ہی ختم کردیا جائے۔ اسی طرح اگر محکمۂ آیوش اردو کو زوال پذیر زبان مان رہا ہے تو اردو کو ختم کرنے کے بجائے اس کے فروغ کی جانب توجہ دی جانی چاہیے۔ محکمہ نے گزشتہ دنوں سی سی آئی ایم کے صدر ڈاکٹر راشد اللہ خاں اور مشیر یونانی سے وضاحت طلب کی کہ یونانی طریقۂ علاج سے اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کرنے پر آپ کی کیا رائے ہے۔ ظاہری بات ہے کہ یا تو محکمہ نے جان بوجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے یا پھر محکمہ کو کسی نے گمراہ کیا ہے کہ ملک سے اردو زبان زوال پذیر ہے۔ محکمہ کا کہنا ہے کہ ملک میں اردو جاننے والے کم ہو گئے ہیں اس لیے طب یونانی کے فروغ کے لیے انگریزی زبان کے ذریعۂ تعلیم کو ترجیح دی جائے۔

محکمہ کے خط کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر راشد اللہ خاں نے کہا کہ ہم اس معاملے کو جنرل باڈی کی میٹنگ میں رکھیں گے اور تمام ممبران کی آرا کے بعد کوئی فیصلہ لیں گے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی مجلس عاملہ اور سالانہ مجلس عام میں فیصلہ لیا گیا کہ سی سی آئی ایم کے تحت بی یو ایم ایس کے لیے ذریعۂ تعلیم اردو کی لازمیت برقرار ہے کیوں کہ ہندوستان میں طب یونانی کا وجود اور تشخص اردو ذریعۂ تعلیم کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ میٹنگ میں یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ کچھ لوگوں کے ایما پر محکمہ آیوش کی آڑ لے کر اردو میڈیم کی لازمی شرط ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ واضح رہے کہ ملک میں تین طریقۂ علاج رائج ہیں جن کی مخصوص زبان ہے۔ ایلوپیتھک کے لیے انگریزی، آیوروید کے لیے سنسکرت اور یونانی کے لیے اردو۔

آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں کا کہنا ہے کہ اگر یونانی کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کردیا جائے تو ایلوپیتھی والے اس پر اعتراض کریں گے کیوں کہ اس سے ان کے پیشے پر فرق پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ یونانی سے اردو کو الگ کرنا ناقابلِ برداشت ہے کیوں کہ یہ یونانی کے تشخص کا مسئلہ ہے۔ (انقلاب، دہلی)

ٹیچرس اہلیتی ٹسٹ اردو میں منعقد کرنے کی اجازت

بیجاپور، کرناٹک (۲رمئی)۔ ٹیچرس اہلیتی ٹسٹ اردو میں بھی منعقد کرنے کی اجازت دیے جانے پر یہاں اردو حلقے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے اور اردو والوں نے اس اہم فیصلے کے لیے ریاستی حکومت کی ستائش کی ہے۔ ریاستی محکمۂ تعلیمات عامہ کے کمشنر جناب محمد محسن کی سفارش پر ریاستی حکومت کے اس خصوص میں جاری احکام کے مطابق ٹیچرس اہلیتی ٹسٹ کنڑا اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو، مراٹھی، تیلگو اور تمل میں بھی منعقد کیے جائیں گے۔ بیجاپور ضلع اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن نے ایک پریس نوٹ میں ٹی ای ٹی امتحان اردو میں منعقد کرانے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے جناب محمد محسن کا شکریہ ادا کیا اور ریاستی حکومت کے سامنے نمائندگی کرنے کے لیے بیجاپور شہر کے رکن اسمبلی ڈاکٹر مقبول باغوان کی کوششوں کو سراہا۔ واضح رہے کہ جیسے ہی ریاست میں ٹی ای ٹی امتحانات کا اعلان کیا گیا تب سے پہلے روزنامہ سالار کے ذریعے ایک رپورٹ شائع ہوئی کہ اردو میں بھی ٹی ای ٹی امتحانات منعقد کیے جائیں، جس کے بعد اردو والوں نے اس مطالبے کو لے کر بنگلور میں کافی جدوجہد کی اور جناب محمد محسن اور مقبول باغوان کی اردو دوستی رنگ لائی۔ (سالار، بنگلور)

جاپان سے اردو اخبار کی اشاعت اردو کی مقبولیت کا ثبوت ہے

دہلی (۲۰ر اپریل)۔ جاپان جیسے ملک سے آن لائن اردو روزنامے کی اشاعت اردو کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اردو نیٹ جاپان کے بانی اور مدیر اعلا ناصر ناکاگاوا کی شخصیت لائق ستائش ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود اردو سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کررہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونی ورسٹی (پٹنہ) کے وائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم نے کیا۔ اردو نیٹ جاپان کے مدیر و چیف بیورو ہندوستان کامران غنی سے اپنی رہائش گاہ پر ایک غیر رسمی ملاقات میں انھوں نے زبان و ادب کے تعلق سے اپنے تاثرات ظاہر کیے۔ اس موقعے پر کامران غنی نے پروفیسر توقیر عالم کو ناصر ناکاگاوا کی تصنیف 'دیس بدیس' پیش کی۔ پروفیسر توقیر عالم نے کہا کہ جاپان اردو کے لیے ناصر ناکاگاوا جیسے لوگوں کی شخصیت لائق تحسین ہے، جو دیار غیر میں رہ کر بھی اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ اس موقعے پر ہندی ہفت روزہ 'ستیہ آنگن' کے نمائندہ خصوصی محمد منور فیضی بھی موجود تھے۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

ٹی ای ٹی امتحان اردو سمیت 8 زبانوں میں لینے کا فیصلہ

بنگلور، کرناٹک (۹ مئی)۔ اس وقت ریاست کرناٹک میں ٹی ای ٹی کے لیے عرضیاں داخل کرنے کا سلسلہ شروع ہے۔ اسی دوران محکمہ تعلیمات کی جانب سے ٹی ای ٹی امتحان (اساتذہ اہلیتی ٹسٹ) اردو، مراٹھی، تیلگو اور تمل کے ساتھ ہندی میں بھی لینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سے قبل یہ امتحان صرف کنڑا اور انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔ گزشتہ دنوں ہر طرف سے اردو والوں نے یہ امتحان اردو میں بھی لینے کا پرزور مطالبہ کیا تھا جس کے بعد یہ فیصلہ لیا گیا کہ اب اردو سمیت آٹھ زبانوں میں ٹی ای ٹی امتحان لیا جائے گا۔ اس ضمن میں بنگلور ضلع کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی جانب سے اردو زبان میں اہلیتی امتحان کے انعقاد کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کرناٹک کے ضلع سکریٹری امان اللہ نظامی نے محکمہ تعلیمات عامہ کے کمشنر محمد محسن کا شکریہ ادا کیا ہے اور انھیں مبارک باد پیش کی کہ انھوں نے اردو اساتذہ کے ساتھ دیگر اقلیتی زبانوں کے اساتذہ کے لیے آسانیاں فراہم کیں۔ ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی اسی طرح اردو کے ساتھ انصاف اور اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو پُر کیے جانے کی امید ظاہر کی ہے۔

(سالار۔ بنگلور)

کولکاتا میں خواجہ شبیر اختر کے مجموعۂ کلام

'مقصد زیست پالیا میں نے' کی رسم رونمائی

کولکاتا (پریس ریلیز)۔ خواجہ شبیر اختر چشتی کے مجموعۂ کلام 'مقصد زیست پالیا میں نے' کی رسم رونمائی پدم شری جناب نیکل انصاری اور پروفیسر مظفر حنفی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ۱۸ر مارچ ۲۰۱۴ء کو خضر پور کولکاتا میں ایک کل ہند صوفیانہ مشاعرے کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس کی صدارت نیکل انصاری اور پروفیسر مظفر حنفی نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض شکیل انصاری نے انجام دیے۔ مشاعرے میں ڈاکٹر محبوب راہی، نسیم اختر خاور، شری شنکر تیموری، شبیر سہسرامی، رضوان الرضا رضوان، تبریز ہاشمی اور ناصر ترنم پوری کے علاوہ مغربی بنگال کے حبیب ہاشمی، افضل حسین افضل، اکبر حسین اکبر، انور حسین انجم، ریحانہ نواب، کوثر پروین، ایم اے طارق، شعیب احمد شورش، ارم انصاری اور فیروز اختر وغیرہ نے اپنے منتخب صوفیانہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ممتاز ادیب اور شاعر سیّد ضمیر حسن دہلوی کی رحلت پر

اردو گھر میں تعزیتی نشست

نئی دہلی (۱۹ر مئی)۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور شاعر جناب سید ضمیر حسن دہلوی کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں ایک تعزیتی نشست انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ سید ضمیر حسن دہلوی کا ۱۹ر مئی ۲۰۱۴ء کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں قبل ان پر فالج کا اثر ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ سید ضمیر حسن دہلوی ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبۂ اردو سے طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ ان کی مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں 'دلّی سے دلّی تک' اور 'بہادر شاہ ظفر کی دلّی' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ سید ضمیر حسن دہلوی دہلی کے نمائندہ ادیب و شاعر تھے۔ انھوں نے دہلی کی تہذیب و تمدن کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے قلم بند کیا۔ وہ دہلی کے اُن چند ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے دہلی کی تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کو غور سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ اُن کے انتقال سے دہلی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو آسانی سے پُر کرنا ممکن نہیں ہے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر عطا کرے۔

سہ ماہی 'اردو ادب' کے اڈیٹر ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ سید ضمیر حسن دہلوی نہ صرف یہ کہ دہلی کے رہنے والے تھے بلکہ دلّی کی قدیم تہذیب اور دہلوی زبان کی ایک نمایاں شخصیت تھی۔ انھوں نے پرانی دہلی کے گلی کوچوں میں ہی تربیت پائی اور یہیں انھوں نے اپنے ماحول، اپنے اجداد اور اپنے احباب کے ساتھ رہتے ہوئے دہلی کی زبان کو اپنی شخصیت میں انگیز کیا۔ وہ نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے اور نثر اور نظم دونوں میں ٹھیٹھ دہلوی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ وہ دہلی ہی کے گلی کوچوں میں پل کر بڑے ہوئے تھے لیکن زندگی کے چند آخری برسوں میں دلّی شہر چھوڑ کر نوئیڈا میں جا بسے تھے جہاں ان کے بچوں نے ایک پُر آسائش مکان میں ان کے آرام سے رہنے کا بندوبست کردیا تھا لیکن اس کے باوجود دہلی سے اپنا ناطہ انھوں نے کبھی توڑا نہیں۔ وہ دہلی کی تمام ادبی سرگرمیوں میں آخر دم تک شریک ہوتے رہے اور نظم و نثر میں برابر لکھتے رہے۔ اب دلّی میں اس طرح کے لکھنے والے شاید خال خال بھی نہیں ہیں، اس اعتبار سے وہ بہت دنوں تک یاد کیے جاتے رہیں گے۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سید ضمیر حسن دہلوی دہلی کی تہذیب و تمدن کے نمائندہ ادیب اور شاعر تھے۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب 'بہادر شاہ ظفر کی دلّی' منظر عام پر آئی جسے خاص طور پر پسند کیا گیا۔ ان کے انتقال سے دہلی کے ادبی و علمی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ سید ضمیر حسن دہلوی ہمارے زمانے کے ان ادیبوں میں تھے جنھوں نے دہلی کی ٹکسالی زبان کو اپنی تحریروں میں محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دہلی کے پرانے ادیبوں کی روایت کو زندہ رکھا۔ ان کی کئی اہم کتابیں اور متعدد مضامین ہیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ اردو کے بہت اچھے اساتذہ میں تھے۔ انھوں نے تمام عمر ذاکر حسین دہلی کالج میں درس و تدریس کے ذریعے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان کے انتقال سے عہد حاضر کے اردو ادب کا ایک روشن گوشہ خالی ہوگیا۔ یہ میرا ذاتی دکھ بھی ہے۔ میں تمام احباب کے ساتھ ان کے خاندان کے دکھ میں شریک ہوں۔

(رپورٹ: محمد عارف خاں)

۱۱ ماہ بعد بھی منتخب اردو میونسپل اساتذہ کا تقرر التوا میں

۱۰ر جون ۲۰۱۳ء سے شروع کی گئی تقرری کی کارروائی میں بی ایم سی نے 428 امیدواروں میں سے 215 کی پوسٹنگ ہی نہیں کی

ممبئی (۱۱ مئی)۔ میونسپل اردو اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے متعدد مرتبہ ہنگامہ اور بار بار یاد دہانیوں کے بعد ممبئی میونسپل کارپوریشن (بی ایم سی) کی جانب سے 429 امیدواروں کو ٹیچر (شکشک سیوک) کے طور پر منتخب کرنے کا اعلان تو کردیا گیا لیکن ۱۱ مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک سیکڑوں امیدواروں کو میونسپل اسکولوں میں پوسٹنگ نہیں دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں استفسار کرنے پر محکمۂ تعلیم نے یقین دلایا ہے کہ تعلیمی سال ۲۰۱۵ء تک بھی امیدواروں کی پوسٹنگ کردی جائے گی۔ پوسٹنگ میں تاخیر کے سبب ممبئی کے بیرونی علاقوں میں رہنے والے امیدواروں کو شدید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ بے چینی سے پوسٹنگ لیٹر کا انتظار کررہے ہیں۔

واضح رہے کہ ۱۰ر جون ۲۰۱۳ء کو اخبارات میں اشتہارات دے کر اردو میڈیم میونسپل اسکولوں میں اساتذہ کی خالی 428 اسامیوں کی بھرتی کے لیے درکار اہلیت رکھنے والے امیدواروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس اشتہار کے بعد ٹیچر (شکشک سیوک) کے تقرر کی کارروائی عمل میں آئی تھی۔ منتخب ہونے والے امیدواروں میں اکثریت بیرون ممبئی سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ ان میں مالیگاؤں، بیڑ، پونے، ناسک اور دیگر اضلاع کے امیدوار شامل ہیں، حالاں کہ بی ایم سی کے ایجوکیشن محکمے کی جانب سے انھیں پوسٹنگ لیٹر روانہ کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے لیکن ۱۱ مہینے سے لیٹر نہ ملنے سے وہ تشویش میں مبتلا ہیں۔

اس ضمن میں اسٹینڈنگ کمیٹی کے رکن رئیس شیخ نے ۹ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کو ایک خط روانہ کیا تھا اور پوچھا تھا کہ اساتذہ کے لیے منتخب کردہ امیدواروں کی پوسٹنگ آخر کب عمل میں آئے گی؟ اس خط کے جواب میں ایجوکیشن آفیسر شمبھوی جوگی نے ۷ر مئی ۲۰۱۴ء کو دیے گئے اپنے جواب میں بتایا ہے کہ منتخب کیے گئے 428 امیدواروں میں سے 130 امیدواروں کو مختلف اسکولوں میں بھیج دیا گیا ہے۔ یہ پوسٹنگ ایجوکیشن افسران کی نشان دہی پر ان اسکولوں میں کی گئی ہے جہاں اساتذہ کی قلت تھی۔ ایجوکیشن محکمے کی جانب سے مزید کہا گیا ہے کہ ڈپٹی میونسپل کمشنر (ایجوکیشن) کے حکم کے مطابق طلبہ کو مفت اور لازمی تعلیم کے قانون حق تعلیم (رائٹ ٹو ایجوکیشن) ۲۰۰۹ء کے تحت طے کیے گئے طلبہ کی تعداد پر اساتذہ کے تقرر کے تناسب کے پیش نظر مزید اساتذہ کی 83 خالی اسامیوں کے لیے ۱۳ر جون ۲۰۱۴ء تک تقرر کیا جائے گا اور اس کے علاوہ باقی 215 امیدواروں کی پوسٹنگ ضرورت کے مطابق ۲۰۱۵ء تک کردی جائے گی۔

یاد رہے کہ اس سے قبل بھی اردو میڈیم کے تئیں بی ایم سی کا سوتیلا سلوک اس وقت سامنے آیا تھا جب مراٹھی میڈیم کے اساتذہ کو اردو میونسپل اسکولوں میں ہیڈ آفیسر (پی او) کے طور پر مامور کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں اخبارات میں متعدد خبریں شائع ہوئے اور عوامی نمائندوں

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار - ایک تجزیاتی مطالعہ
مصنف : ڈاکٹر ہاجرہ بانو
ضخامت : ۳۰۵ صفحات
قیمت : ۴۰۰ روپے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، A-170، گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ دلشاد کالونی، دہلی-95
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب میں انشائیہ کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو یہ صنف بھی مغرب کی دین ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے، جن کا طبعی میلان ابتدا ہی سے انشائیہ کی جانب رہا ہے اور جو خود بھی انشائیہ نگار ہیں، پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مذکورہ موضوع کا انتخاب کرلیا اور مرزا اختر بیگ کی نگرانی میں اس کو بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ حال ہی میں یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ وسیع مطالعے، دقیقہ شناسی اور کڑی محنت کا آئینہ دار ہے۔

پہلے باب 'انشائیہ کے خدوخال' میں مقالہ نگار نے اردو ادب میں انشائیہ کے سفر اور اردو تحریروں میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں ملا وجہی کی 'سب رس' اور مکتوبات غالب کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی نگارشات ہیں جب مغرب میں انشائیہ نگاری کے موجد مونتین اور بیکن پرسنل یا لائٹ ایسیز (Personal or Light Essays) لکھ کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ یہ صنف محمد حسین آزاد (نیرنگ خیال، آب حیات، دربار اکبری)، عبدالحلیم شرر اور چند مزاح نگاروں کے قلم کی زینت بن کر مہدی افادی، حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری اور سجاد انصاری جیسے چند انشائیہ نگاروں کی تحریروں سے پروان چڑھی اور پھر موجودہ دور کے انشائیہ نگاروں جیسے وزیر آغا، اکبر تونسوی، مشفق خواجہ، انور سدید، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین تک آپہنچی۔

اس باب میں 'سب رس' کا مدلل تجزیہ اور انشائیہ کے عناصر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ باب دوم 'انشائیہ ایک منفرد اسلوب نگارش' میں مقالہ نگار نے انشائیہ کی تعریف، اختصاص اور موضوعی تنوع کے حوالے سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اس باب میں یہ بھی کوشش کی ہے کہ انشائیہ اور دوسرے نثری اصناف مثلاً مضمون نگاری، مقالہ نگاری، پیروڈی، خاکہ نگاری اور طنز و مزاح نگاری کے درمیان تفاوت کو اجاگر کرے اور اس بارے میں سرسید، یلدرم، بطرس، کپور، حسن نظامی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کی نگارشات کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے چند معروف انشائیہ نگاروں کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں تاکہ قاری کو انشائیہ نگاری کی خصوصیات کا بخوبی اندازہ ہو سکے اور ایسا کرنے میں وہ سرخرو ہو چکی ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان 'انشائیہ کی اہمیت اور افادیت' ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ "انشائیہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی شعور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔" اس باب میں کئی ہندستانی اور پاکستانی انشائیہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا معتبر انشائیہ نگار ضرور ہیں مگر بقول پروفیسر سلیم اختر اس صنف کے باوا آدم نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں مقالہ نگار کا ادعا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سبب انشائیہ نگاری کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

باب چہارم 'انشائیہ بیسویں صدی میں' کے تحت مقالہ نگار نے ۱۰۵ ہندستانی انشائیہ نگاروں کی فہرست، ان کی پیدائش کا مقام و تاریخ اور مرحومین کی تاریخ وفات پیش کی ہے اور اس کے بعد ان کی حیات اور فن پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ باب پنجم 'انشائیہ پاکستان میں' میں مصنف نے ۳۰ پاکستانی انشائیہ نگاروں کے کوائف اور فن کے بارے میں اختصار کے ساتھ بحث کی ہے۔ باب ششم 'انشائیہ نگاری مغرب میں' کے تحت مقالہ نگار نے مغربی انشائیہ نگاروں جیسے مونتین، بیکن، واس برگ، چارلز لیمب، گارڈنر، لوکاس، بیکن، رابرٹ لینڈ، چسٹرٹن، مائم، ہان تھامس، میکس بیرلوم اور آرویل جارج کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں 'ماحصل' عنوان کے تحت ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اپنے مقالے کا لب لباب بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ جہاں تک اسلوب نگارش کا سوال ہے، انھوں نے غیر ضروری اصطلاحات سے احتراز کیا ہے اور سلیس و شگفتہ زبان میں یہ مقالہ قلم بند کیا ہے۔

مقالے کے حجم اور حد بندی کے مدنظر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اردو ادب میں انشائیہ کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ تصنیف قاری کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ امتحانی نیز ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے شائقین کے لیے بھی یہ حوالہ جاتی درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ زیر نظر کتاب اردو ادب کے لیے ایک نادر تحفہ ہے کیوں کہ موجودہ دور کی سہولت پسندی نے مقالوں کا معیار اتنا پست کر دیا ہے کہ ان میں نہ کہیں وسعت نظر آتی ہے اور نہ ہی عمق۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ہاجرہ بانو مبارکباد کی مستحق ہیں۔

●●●

نام کتاب : فلمی انٹرویو
مصنف : محمد خالد عابدی
ضخامت : ۱۵۶ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : محمد خالد عابدی، مکتبہ عابدیہ ۳۴۳-دل آرام ہاؤس ۱۸ گل روڈ، بھوپال 462001
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

سرزمین بھوپال ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، اس زرخیز سرزمین نے ہر عہد میں علما و ادبا کا قافلہ رواں دواں رہا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا میں ادبی رعنائیاں ہمیشہ سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں سے علوم شرعیہ کے ماہروں نے پوری دنیا میں علم کی شمع روشن کی تو وہیں اردو کے ادبا و شعرا اردو کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، انھی میں سے ایک محمد خالد عابدی ہیں۔ وہ ۱۹۷۷ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے اور ۲۰۰۵ء میں پروگرام ایگزیکٹو کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ خالد عابدی کی اب تک 13 تصنیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک فلمی انٹرویو بھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے 21 فلمی ہستیوں کے انٹرویوز شامل کیے ہیں جن میں سے اکثر وہ ہستیاں ہیں جو اردو ادب کے راستے سے فلمی دنیا میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے چند وہ شخصیات ہیں جو اردو ادب میں ستارہ کی حیثیت رکھتے تھے جیسے احسن رضوی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، خمار بارہ بنکوی، شہر یار، علی سردار جعفری اور عہد حاضر میں ندا فاضلی وغیرہ۔ اختر الایمان کا انٹرویو ایک طویل انٹرویو ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس انٹرویو میں کسی نظم کے شان ورود کے بارے میں سوال کیا گیا ہے جس میں اختر الایمان صاحب نے 'ایک لڑکا' کے متعلق بہت ہی تفصیل سے جواب دیا ہے۔ جہاں تک جاں نثار اختر کا تعلق ہے تو ان کے آبا و اجداد ہی شاعر نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے کئی مشہور شاعر ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ خالد عابدی کے ایک سوال کے جواب میں اپنے شاگردوں کے متعلق بتاتے ہیں: "جس زمانے میں، میں علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا مجھے بی اے کی کلاسیں پڑھانے کے لیے دے دی گئی تھیں۔ شکیل (بدایونی) اس وقت فورتھ ایر میں پڑھتے تھے اور سال بھر تک وہ کلاس میرے سپرد رہا۔ گوالیار وکٹوریہ کالج میں میرے طلبہ میں قدر چغتائی اور ایوب مرزا وغیرہ رہ چکے ہیں۔"

جہاں تک فلموں کا اردو سے تعلق کی بات ہے تو یہ بھی جانتے ہیں کہ فلموں کا وجود ہی اردو زبان کا رہین منت ہے۔ اگرچہ ساری فلمیں ہندی کے لیبل کے ساتھ ریلیز ہوتی ہیں لیکن اکثر کی زبان اردو ہی ہوتی ہے، اس لیے یہ قول عزیز قیسی "فلموں کے مستقبل کو اردو کی طرف سے ضمانت ملی ہوئی ہے" اگرچہ اردو کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ عزیز قیسی صاحب کے انٹرویو میں اکثر لوگوں کے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ سوال اکثر ذہن میں آتا ہے کہ آخر فلمیں اردو میں بنتی ہیں لیکن ان کا سرٹیفکٹ ہندی کا دیا جاتا ہے۔ اس کا جواب عزیز قیسی دیتے ہیں: "اردو کے سرٹیفکٹ فلموں کو دیے نہیں جاتے۔ فلم ساز ہندی کے سرٹیفکٹ سرکار سے مانگتے ہیں اور انھیں ہندی کے سرٹیفکٹ دیے جاتے ہیں۔ جو دو چار اردو کے سرٹیفکٹ آپ نے پردۂ سیمیں پر دیکھے ہوں گے وہ فلم سازوں کو مانگنے سے ملے ہیں۔ سرکار کو قانون کے مطابق دستوری (۱۵) زبانوں میں علاحدہ سرٹیفکٹ دینا ہے۔ اب یہ فلم ساز کی مرضی ہے کہ کس زبان میں سرٹیفکٹ مانگتا ہے۔"

اس کتاب میں شامل اور دوسرے انٹرویوز سے بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً ہر ایک کے تخلیقی کارنامے، تخلیقی مجموعے جن سے ہم بہت کم واقف ہو پاتے ہیں خصوصاً فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں کے۔

●●●

بقیہ: فارسی میں ہندستان کے...

صفحہ ۳ سے آگے

رنگا رنگ اور پرشکوہ تصویروں سے مزین اور آراستہ ہو وہ کم ظرفی، وحشت مزاجی، بداخلاقی اور بدکرداری کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ کتابیں جو صدیوں تک ہمارے اسلاف کے ذہنوں اور اجتماعی کردار پر سایہ افگن رہی ہیں، رفتہ رفتہ غیر مروج ہو کر نایاب ہو گئیں اور عرصہ ہوا ہندستان کے لوگ ان کے بیش قیمت فوائد سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس نقصان کا ایک نتیجہ تو اس وحشت انگیزی اور بداخلاقی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جو نئی نسلوں کے اخلاق و کردار میں گویا سرایت کر گیا ہے۔ دوسرا نتیجہ جس کا تعلق خالص لسانی اور تہذیبی دائرے سے ہے وہ اسلوب، افکار کے تنوع اور وسعت سے محرومی کا ہے۔ سعدی، نظیری، مولانا روم، حافظ اور فردوسی کے مذکورہ افکار و خیالات، تعلیم اور تربیتی عناصر کے ساتھ ہمارے تہذیبی رشتوں کا خاتمہ جنھوں نے صدیوں تک نہ صرف ہندستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن کے باغ کو سینچا بلکہ دنیا کے ادب عالیہ کو متاثر کرنے کی بے مثال قوت کا مظاہرہ کیا، یقیناً ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی کی کوشش ایسی خدمت کی جا سکتی ہے جس سے زیادہ تحسین و تعریف کی مستحق کوئی دوسری خدمت نہیں ہو سکتی۔

اس لیے ہندستان میں آج جو جامعات، کالج یا دوسری درس گاہیں فارسی زبان و ادب کی تعلیم کا نظام چلا رہے ہیں ان کی ملک و قوم کو قدر اور حکومت کو ان کی بقا کی فکر کرنا چاہیے۔

(یہ مقالہ ۲۶ مارچ ۲۰۱۳ء کو برکت اللہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے بین الاقوامی سمینار بہ عنوان 'ہندستانی فارسی ادب: ایک تحقیقی جائزہ' میں پڑھا گیا)

●●●

بقیہ: ابن صفی کا تخلیقی و ادبی رجحان

صفحہ ۲ سے آگے

1989) نے 1946 میں کانپور کے ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کی اور وہیں سے مشہور ہوئے۔ شاعر لکھنوی 1948 میں پاکستان چلے گئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے۔ ان کی تصانیف میں "زخم ہنر" بھی شامل ہے۔

شاعر لکھنوی نے ابن صفی میں اسرار احمد ناروی کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ 1972 میں ابن صفی کی ادبی اور شعری خدمات پر ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"...ان کی شاعری پردہ نشین کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ پردہ نشینی کسی عیب یا کمی کی بنا پر نہیں بلکہ فقط ارباب نظر کی بے توجہی پر اختیار کی گئی ہے۔ ورنہ ان کی نظموں اور غزلوں میں تازگی و تہہ داری کی جو فضا، سمت و منزل کی جو پہچان، الفاظ و معنی کی جو ہم آہنگی، اظہار و بیان کی جو رنگا رنگی اور قدیم و جدید کی جو دھوپ چھاؤں موجود ہے وہ خطوں سے کہیں زیادہ محفلوں میں اپنے چراغ روشن رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے...۔"

ابن صفی کا شمار ان کمیاب شہرۂ آفاق ادیبوں، شاعروں، ناول نگاروں اور انشا پردازوں میں ہوتا ہے جن کی مثال تفریح فہم کے لیے مرزا غالب، علامہ اقبال، پریم چند اور سعادت حسن منٹو سے بھی دی جا سکتی ہے کیوں کہ ان کی تحریروں کو سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا ہے اور جن پر پوری ادبی دنیا کا حق ہے۔ ان کی تخلیقات کو ہر اردو داں تک پہنچانا ہماری ادبی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس سے اردو زبان کی توسیع و اشاعت کا اہم فریضہ بھی ادا ہوتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ علامہ نیاز فتح پوری (1884 — 24 مئی 1966، کراچی) ماہنامہ "نگار" کے مدیر تھے۔ ابن صفی پر تنقید کرتے تھے۔ نیاز کے ادبی رویے نے بہتوں کو پریشان کیا تھا۔ منشی پریم چند نے نیاز پر ایک سخت مضمون بھی قلم بند کیا تھا جو "زمانہ" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون مدیر صدیقی صاحب نے حال ہی میں "اردو میں [illegible]" کے عنوان سے [illegible] (۱۰ اپریل ۲۰۱۳) میں شائع کیا ہے۔

۲۔ ابن صفی کون؟ مؤلف: مشتاق احمد قریشی، کراچی، صفحہ 57

۳۔ حضرت نوح ناروی (18 ستمبر 1878 — 10 اکتوبر 1962)۔ استاد داغ کے قریبی شاگرد۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور ہر روز ایک غزل کہنا ان کا معمول تھا۔ تین دیوان سفینۂ نوح، طوفان نوح، اعجاز نوح منظر عام پر آئے۔

۴۔ یادش بخیر ابن صفی، مؤلف: مشتاق احمد قریشی، مارچ 2013، کراچی، صفحہ 192

۵۔ یادش بخیر ابن صفی، صفحہ 321

۶۔ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، مرتب و مؤلف: محمد عارف اقبال، جون 2013، صفحہ 13 تا 23، ابن صفی کا ادبی نصب العین۔

۷۔ روایت اور بغاوت، سید احتشام حسین (تحریر 1948) مطبوعہ 2005، صفحہ 115، ناشر: اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔

۸۔ روایت اور بغاوت، سید احتشام حسین، صفحہ 119

۹۔ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ 83

۱۰۔ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، صفحہ 80

۱۱۔ ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، مرتب و مؤلف: راشد اشرف، کراچی، جنوری 2012، صفحہ 190، 193

۱۲۔ داستانوں کی داستان (جلد اول)، احمد حسین صدیقی، کراچی، صفحہ 233-232

۱۳۔ ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، راشد اشرف، کراچی، صفحہ 196

■■■

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

کے ذریعے واویلا مچانے کے بعد غیر اردو داں ہیڈ آفیسر کو ہٹا کر ان کی جگہ اردو میڈیم کے اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔

آر ٹی ای کی مختصر معلومات

آر ٹی ای کے تحت مہاراشٹر حکومت کو اس کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ 6 تا 14 سال کی عمر کے بچوں کو پہلی تا ہشتم جماعت مفت تعلیم دے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بچے کی عمر کے اعتبار سے جماعت میں اس کا داخلہ لیا جائے اور اگر بچہ پڑھائی میں کمزور ہے تو خصوصی انتظام کر کے اس کی کمی کو دور کیا جائے۔ غریب طلبہ کو مفت تعلیم دینے کی ذمہ داری شہری انتظامیہ پر عائد کی گئی ہے جس کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے ضروری فنڈ مہیا کرایا جاتا ہے۔

آر ٹی ای کے تحت اساتذہ کا تقرر

آر ٹی ای کے تحت پہلی تا پانچویں جماعت 60 طلبہ پر دو ٹیچر (اس اعتبار سے 30 طلبہ پر ایک ٹیچر) کا تقرر کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح 61 تا 90 طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے تین اساتذہ، 91 تا 120 طلبہ کے لیے چار، 121 تا 200 طلبہ کے لیے پانچ اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ 150 سے 199 طلبہ کے لیے پانچ ٹیچر اور ایک ہیڈ ماسٹر وغیرہ۔ آر ٹی ای کے مطابق ششم تا ہشتم جماعت کے 35 طلبہ کے لیے ایک ٹیچر کا تقرر کرنا چاہیے۔ جہاں 100 سے زیادہ طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے وہاں پورے دن ہیڈ ماسٹر کا ہونا لازمی ہے۔ آر ٹی ای نافذ کرنے کے لیے ۱۳ دسمبر ۲۰۱۳ کو حکومت مہاراشٹر کی جانب سے جی آر (نمبر ایم ایم-۳۰) جاری کیا گیا ہے۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

آئینۂ ماضی میں بہزادؔ لکھنوی کا عکسِ جمیل

سید لطیف حسین ادیب (73- پھول والان، بریلی-243003)

حسنِ اتفاق کہ مجھے چند برس قبل آکاش وانی بریلی سے شب کے ۹ بجے خبروں کے فوراً بعد پروگرام 'رنگِ غزل' میں بہزاد لکھنوی کی غزلیات کو مشہور مغنیہ اختری فیض آبادی کی آواز میں سماعت کا موقع ملا۔ اختری فیض آبادی کو کبھی بالمشافہ یا اسکرین پر دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا لیکن میں نے بہزاد لکھنوی کو پہلی بار خانقاہ نیازیہ محلہ خواجہ قطب، بریلی میں خود دیکھا۔ سنہ تو یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ وہ زمانہ حضرت شاہ محمد تقی رازؔ المعروف بہ عزیز میاں (م ۱۷ جنوری ۱۹۷۶ء) کی سجادہ نشینی کا تھا۔ بہزاد لکھنوی جب بھی تشریف لاتے، خانقاہ نیازیہ ہی میں قیام کرتے تھے۔ انھوں نے شاہ محمد تقی رازؔ کا مجموعۂ کلام مسمّی بہ 'راز و نیاز' ۱۹۴۳ء میں مرتب کیا تھا جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ دراصل خانقاہ نیازیہ بریلی میں شعرا کی سرپرستی کی روایت اور مقررہ تاریخوں پر مشاعروں کے انعقاد کا سلسلہ حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ (م ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۴ء) کے عہد سے جاری ہے۔ یہ خانقاہ اپنی ذات میں ایک مرکزِ علم و فن سے کم نہیں ہے۔

بہزاد لکھنوی کے ورود پر خانقاہ نیازیہ بریلی میں ایک مخصوص شبانہ شعری نشست کا انعقاد ضرور ہوتا جس میں شہر بریلی کے مخصوص شعرا و سامعین شریک ہوتے تھے۔ ایک ایسی ہی مخصوص نشست میں راقم الحروف اور جواں العمر شاعر سید رفعت حسین کیفی وجدانی (م ۱۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۳ اگست ۱۹۸۸ء) کو شرکت کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سردار احمد خاں بہزاد لکھنوی کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اختری فیض آبادی کی آواز میں ان کی غزلیات کے ہز ماسٹرس وائس کے ریکارڈوں کے ذریعے ان کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی تھی اور لوگ راہ چلتے:

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

گنگناتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ بہزاد کی عشقیہ غزلیات کو غیر معمولی شہرت عطا کرنے میں اختری فیض آبادی کے ترنم کا بھی دخل ہے۔

مقررہ وقت پر خانقاہ نیازیہ بریلی میں داخل ہونے کے بعد راقم الحروف کی پہلی نظر بہزاد لکھنوی پر پڑی۔ بہزاد لکھنوی گاؤ تکیہ سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا حلیہ کچھ ایسا تھا: نحیف جثہ، درمیانی قد، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخملی ٹوپی، سپید سادہ قمیص و پاجامہ، گلے میں کپڑے کی دھجی اور دھجی کے پھندے میں ذکر کر چلتا ہوا ایک ہاتھ کا انگوٹھا۔ شعرا و سامعین ان کے سامنے ایک حلقے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ مشاعرے کا آغاز کیفی وجدانی کی غزل سے ہوا۔ سامعین میں سے کسی نے فرمائش کی "کیفی بھائی وہ غزل:

وہ لکھے لیے ہے گیسو نہیں لاکھ تم سنوارو
مرے ہاتھ سے سنورتے تو کچھ اور بات ہوتی"

لیکن کیفی نے فرمائش کو نظرانداز کیا اور اپنے مخصوص حزنیہ ترنم میں جو غزل نذرِ سامعین کی اس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ہر دل کی التجا خاں ہے، تیرا ترنم میری غزل
ہر داستاں پر اثر نہیں ہے، تیرا ترنم میری غزل
تیرا ترنم حسنِ بیاں ہے، میری غزل جس الفاظ
آں ربطِ الفاظ دیواں ہے، تیرا ترنم میری غزل
زہرہ جبیں کو پھول بنا ہے، میں بھی جبیں کو پھول بنا
اس افسانے کا عنواں ہے، تیرا ترنم میری غزل
طوفِ خلوتِ عروسی کے سوزِ عشق میں روشن ہیں
پہلو محفل کی افشاں ہے، تیرا ترنم میری غزل
کتنی سہیلیں ڈوب گئی ہیں، ماضی کی گہرائی میں
کتنی یادوں پر احساں ہے، تیرا ترنم میری غزل

اس واقعاتی غزل کی تلمیح سے کیفی کے احباب واقف تھے۔ کیفی نے شاید یہ غزل بہزاد لکھنوی کے سامنے اختری فیض آبادی کے ترنم کو ذہن میں رکھ کر پڑھی تھی۔ غزل نے بہزاد کو بہت متاثر کیا۔ ان پر کیفیت طاری ہو گئی۔ حضور کی دھجی میں انگوٹھے کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ بہزاد گویا اپنے ہی شعر کی تصویر بن گئے:

کیف اسی کا نام ہے، عشق اسی کا نام ہے
میرے خیال میں ہوں، اپنا خیال کچھ نہیں

کیفی ڈیوٹی پر جانے کا عذر کر کے محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ کیفی کے جانے کے بعد مشاعرہ جاری رہا۔ کئی مقامی شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں بہزاد لکھنوی کی باری آئی۔ سامعین میں سے کسی نے بہزاد سے فرمائش کی "محترم وہ غزل... ہر چیز مقابل آ جائے"۔ بلاشبہ بہزاد لکھنوی کی یہ مشہور ترین غزل ہے۔ حسنِ اتفاق کہ اس غزل کو بہزاد سے ہی سماعت کا موقع ملا۔

اس زمانے میں ترنم سے غزل پڑھنے کا رواج تھا۔ شعرا اپنے ترنم کے لیے بھی مشہور تھے۔ جگر مرادآبادی (علی سکندر، م ۱۹۶۰ء)، شکیل بدایونی (شکیل احمد، م ۱۹۷۰ء)، نشور واحدی (حفیظ الرحمن، م ۱۹۸۳ء)، تشنہ نظامی کانپوری (مرزا نثار بیگ، م ۱۹۸۸ء)، خمار بارہ بنکوی (محمد حیدر خاں، م ۱۹۹۹ء)، مجروح سلطانپوری (حکیم اسرار حسن خاں، م ۲۰۰۰ء) مشاعروں میں ترنم کی وجہ سے بھی مقبول تھے۔ بہزاد لکھنوی کے متعلق بھی مشہور تھا کہ ان کے گلے میں بھی بجتی ہے۔ بہزاد نے اپنے مخصوص ترنم میں غزل پیش کی جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اے جذبِ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے
اے دل کی خلش چل یوں ہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب سامنے منزل آ جائے
ہاں یاد مجھے تم کر لینا، آواز مجھے تم دے لینا
اس راہِ محبت میں کوئی درپیش جو مشکل آ جائے

رات کا وقت، اشعار کی تاثیر، سحر انگیز ترنم اور خود شاعر کی مستانہ کیفیت، بس ایک سماں بندھ گیا جو اتنا طویل وقت گزرنے کے باوصف چشمِ تصور میں اس طرح محفوظ ہے گویا شبِ گزشتہ کی بات ہے۔ ہو اتنا ہی نہیں، ان کے بعض اشعار ضرب الامثال کی طرح ذہن پر ثبت ہو چکے ہیں جن سے خانقاہ نیازیہ بریلی کے مشاعرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں
گو دہر میں ہوئی ہیں کئی سے جدا ہوئے
لیکن یہ دل کی آگ ابھی تک بجھی نہیں

مٹنے کا غم نہیں ہے بس اتنا ملال ہے
کیوں تیرا انتظار کیا، ہائے کیا کیا

بہزاد لکھنوی نے اپنی ظاہری بے قاعدہ زندگی کے باوجود اتنی ہوشیاری ضرور کی کہ اپنے کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ راقم الحروف نے ان کی اُنیس مطبوعات کی فہرست تیار کی جو مندرجہ ذیل ہے:

(۱) بت کدہ (۲) بیانِ حضور (۳) ثنائے حبیب (۴) چراغِ طور (۵) سیرتِ پاک (منظوم) (۶) کیف و سرور (۷) کفر و ایمان (۸) موجِ طہور (۹) نعتِ رسول (۱۰) نغمہ و نور (۱۱) آہ و تمام (۱۲) مصحفِ بہزاد (۱۳) موجِ نور (۱۴) نغماتِ حضور (۱۵) نقشِ بہزاد (۱۶) بستان بہزاد (۱۷) سوگیت (۱۸) نغمات بہزاد (۱۹) وجد و حال

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعت گو بھی تھے اور اپنی ظاہری حالت کے باوصف ان کی سرشت میں ثنائے حبیب پیوست تھی۔

محمد سردار خاں بہزاد ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جائے ولادت لکھنؤ ہے۔ معلوم نہیں ان کے ترکِ وطن کی وجہ کیا تھی۔ ان کی ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو کراچی میں وفات ہوئی۔

تاہم بہزاد لکھنوی کی حیات اور ان کے ادبی اکتساب کے ہر ممکن پہلو کی تحقیق اور ان کے ہم عصر ادبی ماحول کے پس منظر میں ان کے کلام پر نقد و تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست

حواشی:

۱۔ ابن مولوی محمد صدیق نبیرہ حضرت شاہ محی الدین۔ پیدائش بچھراؤں، ضلع مرادآباد (یوپی)۔ تلمیذ بہزاد و محمد حسن شوق بچھرایونی جن کا سلسلۂ تلمذ مومن خاں مومن (م ۱۸۵۱ء) سے ملتا ہے۔ حضرت شاہ محی الدین کے وصال کے بعد ۱۹۲۳ء میں سجادہ نشین ہوئے۔ راز، بیانِ راز، رازِ معراج، رازِ محبت، راز و نیاز، رازِ بندگی، رازِ تخلیق، رازِ حقیقت، عرفانِ راز، ان کی تصانیف ہیں (رک وفیاتِ مشاہیر اردو، از بشارت علی خاں فروغ رامپوری، مطبوعہ دہلی، ص ۱۵۶)۔ آپ موصوف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

۲۔ رک راقم الحروف کا مضمون 'اسیر رفعت حسین کیفی وجدانی بریلوی' ہفت روزہ 'ہماری زبان' ۷ تا ۱۳ فروری ۲۰۰۳ء۔

۳۔ کیفی وجدانی بریلوی نارتھ ایسٹرن ریلوے عزت نگر ڈویژن بریلی میں ٹی ٹی ای تھا۔

●●●

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org